eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

CC BY
OPEN ACCESS

انتظار حسین کے افسانے ”کچھوے“ کا تنقیدی جائزہ

Critical Analysis of Intzar Hussain's Short Story "Kachway"

ڈاکٹر خرم علیم، لیکچرر، گورنمنٹ ملت ڈگری کالج، غلام محمد آباد، فیصل آباد

Dr. Khuram Aleem, Lecturer, Govt. Millat Degree College, Ghulam Muhammadabad, Faisalabad.

ماجد مشتاق، لیکچرر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Majid Mushtaq, Lectuer, Department of Urdu, Govt. College University, Faisalabad.

Abstract

This Essay is a critical analysis of INTZAAR HUSAIN,s short story "Kacheway", "Kacheway" is a Symbolic short story. This Short story has been narrated with the help of "JATAK KAHANIAN" Which relate to MAHATMA BUDH birth and life. The mythology which extract from budha,s philosophy is based on this very short story. The Metamorphosis' of a human being as depicted in this story a human being in ancient ages as well as in contemporary period is the main theme of this Story. This article helps us to understand the symbolic aspects of this piece of prose.

Keywords: Kachway, Jatak, Dewmala, Mahatma Budh, Metamorphosis.

کلیدی الفاظ: کچھوے، دیومالا، جاتک، مہاتما بدھ، تبدیلی قالب۔

انتظار حسین کے افسانے پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس شدت سے ہوتا ہے کہ وہ داستان گوئی، قصّہ گوئی، دیومالا، کہانی، کتھا، جاتک اور جدید افسانے کے رموز و اسرار سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے افسانوں میں افسانہ نگاری بظاہر قصہ گوئی کے قریب قریب نظر آتی ہے، مگر وہ جدید افسانے کی تکنیکی باریکیوں کو بھی سمجھتے تھے۔ یہ افسانے فنِ افسانہ نگاری کے حوالے سے بہت ہی پختہ بنیادوں پر کھڑے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے اکثر اوقات یہی محسوس ہوتا ہے کہ شائد سیدھی سادی کہانی بیان کر دی گئی ہے، مگر ان قدیم کہانیوں میں انتظار

حسین، جدید افسانوی تکنیک اور اپنے ذاتی احساس کو غیر محسوس طریقے سے سمو دیتے ہیں۔ اساطیر اور قصے کہانیوں کی اساس پر استوار یہ افسانے عہدِ جدید کے انسان کے داخلی و باطنی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

انتظار حسین کے ادبی نظریے پر رجعت پسندی کا الزام آنکھ بند کر کے لگا دیا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کے وہ تنقیدی نظریات ہیں جن کا اظہار انہوں نے ''علامتوں کا زوال'' میں کیا ہے۔ انتظار حسین اس کتاب میں جدت اور تبدیلی سے ''بظاہر'' خائف نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں نئی تہذیب کی مثال ٹروجن ہارس(Trojan Horse)کی ہے جس کے پیٹ میں جدت کے نام پر مہلک نظریات چھپے ہوئے ہیں یہ نظریات قدیم تہذیب اور روایات کے لیے یاجوج ماجوج کی لمبی زبانوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں جنوں، پریوں، شہزادوں، دیوزادیوں، چڑیلوں، بچھل پائیوں، جادوگروں، بھوت پریت، بندروں اور کتوں کے قالب میں تبدیل ہوتے انسانوں، مکھی کی جون بدلتے شہزادوں اور ایسے ہی مافوق الفطرت واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ مگر یہ تمام عناصر ان کے افسانوں میں صرف ماضی کا اظہار نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کردار اور واقعات اِن کے ہاں علامتی حیثیت اختیار کرتے ہوئے عہدِ جدید کے انسانی معاشرے کے بعض بنیادی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''یہ وہی دور تھا جب انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں اُن بستیوں کی باتیں شروع کیں، جو اپنے اعمال کی سزا کے طور پر بندروں کی بستیوں میں تبدیل کر دی گئیں۔ اُن مُردوں کا ذکر شروع کیا جو زندہ لوگوں کا رزق کھا جاتے ہیں، پھر یہ ذکر جاری رہا، شخصیت کی پہچان گم ہونے کا ذکر، انسانوں کے مکھی، بندر میں تبدیل ہونے کا ذکر، حرص و طمع کے زرد کتے کا ذکر۔ اس طرح کی باتیں اس عہد میں جس نے بھی کیں، اسے عقل دشمن کہہ کر پرے ڈال دیا گیا۔ کہا گیا کہ یہ شخص معاشرے کا دشمن ہے۔ اسی لیے مایوسی پھیلا رہا ہے۔ اِس طرف دھیان نہ گیا کہ کسی روز شخصیت کی تہہ میں مایوسی کا ''سیم نالہ'' پھٹ گیا تو کیا ہو گا، جب یہی نہ مانا گیا کہ کسی سطح پر کوئی گڑبڑ موجود ہے تو اس کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے۔'' (۱)

انتظار حسین کے افسانے موجود عہد اور مستقبل کی معنوی حقیقتوں کو ایک مربوط علامتی نظام کے تحت بیان کرتے ہیں۔ ان معنوی حقیقتوں کا بیان جنوں پریوں کے واقعات کا

ذکر نہیں۔ بلکہ عہدِ موجود اور مستقبل کے انسانوں کے ذہنی، شخصی، جذباتی، معاشرتی، سیاسی، سماجی، نفسیاتی، قلبی، فوقی، مافوقی، اعتقادی، طبعیاتی اور مابعد الطبعیاتی، مسائل کا علامتی اظہار ہے، اُس انسانی صورت حال کا اظہار ہے جس کا سامنا عہدِ جدید کا انسان کر رہا ہے۔

''کچھوے'' کا شمار انتظار حسین کے اہم ترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہ افسانہ بدھ دیومالا کے بطن سے پھوٹا ہے۔ اس افسانے میں، چھوٹے چھوٹے واقعات کے بیان سے ایک بڑی معنوی فضا بنائی گئی ہے۔ ان واقعات کو ہم حکایات بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تمام حکایات بدھ دیومالا سے لی گئی ہیں۔ جو عہدِ قدیم سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ موجود عہد کے لیے بھی فکری معنویت رکھتی ہیں۔ اسی فکری معنویت کا اظہار انتظار حسین کو اس افسانے کی تخلیق پر مجبور کرتا ہے۔ (یہاں ایک بات کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس افسانے کا ایک فکری تجزیہ علم الانسان، (Anthropology) کے حوالے سے بھی کیا جا سکتا ہے، مگر زیرِ نظر مضمون کا دائرہ کار اس افسانے کے علامتی اور فکری نظام تک محدود رہے گا۔)

اگر ہم اس افسانے (کچھوے) کو دیکھیں تو اس میں کچھ جاتکتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان مختلف جاتکوں کے بیان کے اندر ہی اس افسانے کی گہری معنویت چھپی ہوئی ہے۔ قاری پہلی بار اس افسانے کو پڑھتا ہے تو الجھ جاتا ہے کہ آخر اس افسانے کے مفہوم و مطالب کیا ہیں۔ بادی النظر میں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہاں صرف چند چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو بیان کر دیا ہے جو کہ بدھ مت مذہب سے لی گئی ہیں۔ تو کیا ان کہانیوں کا بیان اس تحریر کو افسانہ بناتا بھی ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ اس افسانے کا بیانیہ صرف دیومالا یا اسطورہ کا ایک ایسا بیان ہے جو قاری کو معنی فراہم نہیں کرتا۔ یا یہ کہ یہ افسانہ انتظار حسین کی قدامت پسندی کی ہی ایک مثال ہے۔

اس افسانے کے بارے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ اس کا تعلق ہندی دیومالا سے نہیں ہے۔ اس افسانے کا تعلق بنیادی طور پر بدھ دیومالا سے ہے۔ اب ذرا جاتک لفظ کے بنیادی معنی کو سمجھ لیتے ہیں۔ جاتک سے مراد وہ حکائتیں یا کہانیاں ہیں جو گوتم بدھ (سدھارتھا) کی پیدائش کے بارے میں ہیں۔ مہاتما بدھ کی پیدائش کے بارے میں جو پانچ سو پچاس کہانیاں ملتی ہیں ان کو جاتک کہا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ جاتکیں زیادہ تر (God in Carnate) اوتار کے نظریے کو بیان کرتی ہیں۔ بدھ نظریات کے مطابق مہا آتما یعنی سب سے بڑی آتما نے بدھ کے روپ میں پرواس (ظاہر ہونا) کیا۔ مہا آتما، جو اس ساری کائنات سے عظیم تر بھی ہے اور اس کے ایک ایک ذرے میں سرایت پذیر بھی ہے وہ مختلف انواع، حیاتیاتی نسلوں (یعنی جانداروں) کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ کبھی مینا کی شکل میں تو کبھی بندر کی شکل

میں۔ اس مہا آتما کے سو روپ ہیں۔ ہر روپ میں مہا آتما ظاہر ہو کر انسانوں کی رہنمائی، فلاح اور بہبود کا کام سر انجام دیتا ہے۔

افسانے کا آغاز بدھا کے جسمانی طور پر دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد کے دور سے ہوتا ہے۔ بدھا کے اُٹھ جانے کے بعد بھکشوؤں نے اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ انھیں آپس میں لڑتے دیکھا گیا، بھکشوؤں نے زمین پر سونا چھوڑ دیا۔ اب وہ وہی کرتے جو ان کا نفس چاہتا ہے وہ کھاٹ پر سوتے ہیں اور دنیا کی لذتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔

"ودیا ساگر" جو بدھا کا حقیقی پیروکار اور گیانی (عارف) ہے وہ یہ سب دیکھ کر چپ ہو جاتا ہے۔ اور اسی چپ کو مصلحت جانتا ہے اور ایک پر سکون مورتی (بت) بن کر بیٹھا رہتا ہے۔ سندر سمدر اور گوپال اس کے پاس آتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ آپ کچھ تو بولیے۔

"گوپال ڈھئی آواز میں بولا:" کیسا اندھیرا ہے کہ جنھیں نہیں بولنا چاہیے وہ بول رہے ہیں" جسے بولنا چاہیے وہ چپ ہو گیا ہے۔۔۔۔ہے گنی اے گیانی تو کیوں نہیں بولتا؟"

یہاں وڈیا ساگر آنکھیں کھولتا ہے اور سندر سمدر اور گوپال سے طوطے کی جاتک (کہانی) کہتا ہے۔

"تم نے طوطے کی جاتک سنی ہے؟

"نہیں"

"تو پھر سنو" بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں پریم دت کا راج تھا اور ہمارے بدھ دیو جی نے طوطے کے روپ میں جنم لیا تھا۔ طوطے کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ دونوں چھوٹے تھے کہ ایک چڑی مار نے انھیں پکڑ لیا اور بنارس کے ایک برہمن کے ہاتھ بیچ دیا۔ برہمن نے دونوں طوطوں کو ایسے پالا جیسے اولاد کو پالتے ہیں۔ ایک بار برہمن کو پردیس جانا پڑا۔ جاتے ہوئے طوطوں سے کہہ گیا کہ مٹھو وتنک اپنی ماتا کا دھیان رکھنا۔

"برہمن کے جانے کے بعد وہ ناری کھُل کھیلی۔ چھوٹے طوطے نے اسے ٹوکنے کے لئے پر تولے۔ بڑے نے کہا۔ بند ھو، تو بیچ میں مت بول، پر چھوٹا نہ مانا اور ناری کو ٹوک بیٹھا۔ اُس چاتر ناری نے بھولی بن کر کہا کہ اچھا اب میں کوئی پاپ نہیں کروں گی۔ تو نے ٹوک دیا، اچھا کیا۔ باہر آ

تجھے پیار کروں وہ بھولا باہر آ گیا۔ ناری نے جھٹ اُس کی گردن مروڑ دی۔" (۲)

اس جاتک کا باطن (مفہوم) یہ ہے کہ کسی کو نصیحت اپنی حیثیت اور طاقت دیکھ کر کرنی چاہیے۔ اور عورت کے مکر میں نہیں آنا چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے آمادہ بر گناہ اور اور احمق آدمی کو نصیحت مت کرو، اس جاتک کے بعد ودیا ساگر تین رات آلتی پالتی مارے آنکھیں موندے، بے کھائے پیئے بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں سندر سمدر نے موقعہ اچھا جان کر کہا۔

"ودیا ساگر تو ہمارے بیچ بدھی مان ہے۔ گیانی ہے۔ چل واپس اور بھکشوؤں کو سکشا دے تب ودیا ساگر نے مینا کی جاتک کہی۔ ودیا ساگر اگلے جنم کی بات ہے کہ بنارس میں راجہ برہم دت براجتا تھا اور ہمارے بودھ دیو جی مینا کے جسم میں جنگل میں باس کرتے تھے... ایک بار بہت ورشا (بارش) ہوئی۔ بندر بھیگتا ہوا کہیں سے آیا اور اسی پیڑ پر مینا کے گھونسلہ کے برابر بیٹھ گیا۔ مینا بولی کہ۔ ہے باندر! ویسے تو آدمی کی نقالی کرتا ہے مگر گھر بنانے میں اس کی نقالی کیوں نہیں کرتا... بندر بولا کہ، پیاری مینا! میں نقل کرتا ہوں پر عقل نہیں۔ پھر بندر نے سوچا مینا اپنے گھر میں بیٹھی باتیں بنا رہی ہے۔ اس کا گھر نہ ہو تو میری طرح بھیگے ... یہ سوچ کر اس نے مینا کے گھونسلے کو کھسوٹ ڈالا۔" (۳)

اس جاتک کا تت (سبق) یہ ہے کہ ہر ایرے غیرے کو نصیحت کرنا مفت میں مصیبت مول لینا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سعادت سعید کی رائے دیکھیے:

"پتے اور کچھوے خاص ہندی مزاج کے افسانے ہیں ان افسانوں میں فیبلز کے استعمال سے اردو افسانے میں نئی معنویت کی تشکیل کا دبستان کھولا ہے۔ کچھوے میں طوطے، مینا، بندر، بکری اور کچھوے کی جاتکوں کے نتائج پر غور کرنے ہی سے معنویت کے کئی دروازے وا ہوتے ہیں۔ طوطا بولتا ہے اس کی گردن مروڑ دی جاتی ہے۔ مینا نے بندر سے کہا کہ وہ بارش سے بچنے کے لیے وہ گھر کیوں نہیں بناتا بندر نے اس کا گھونسلہ نوچ پھینکا:" (۴)

پچھلی دو جاتکوں کا نتیجہ یہاں انتظار حسین کے نقطہ نظر سے واضح ہو جاتا ہے کہ، جس طرح دھن کی حفاظت کرتے ہو اسی طرح زبان اور نصیحت کی حفاظت کرو۔ ڈاکٹر

سعادت سعید نے بھی اپنے رائے میں اِسی موقف کی تائید کی ہے کہ بلا ضرورت نصیحت اور نصائح کرنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے۔

اب ذرا مینا اور بندر والی جاتک پر ہلکا سا دھیان دیں تو ہماز اذہن فوراً اس بات کو محسوس کرے گا، کہ جب پورے کا پورا معاشرہ ہی بندر بن جائے تو ایسے میں نصیحت کی جائے تو کسے کی جائے۔ یہاں بندر بننا جسمانی طور پر نہیں، بلکہ رویے میں بندر بن جانا مراد ہے۔ تو کیا انتظار حسین کا یہ افسانہ، دیو مالا کے قدیم مفہوم کو نئے مفاہیم فراہم نہیں کرتا۔ کیا طوطے، اور بندر کی جاتک ایک نئے علامتی پیکر میں جلوہ گر نہیں ہو رہی۔ یا یہ کہ حقیقی سطح پر یہ جاتک (دیو مالا) ہمارے موجود عصری آشوب کی نمائندگی نہیں کرتی؟ تو کیا اب بھی ہم انتظار حسین کو قدامت پسند ہی تصور کریں گے۔ کیا اب بھی یہی کہیں گے کہ اپنی عمومی معاشرت کے مسائل کا درست اِدراک انہیں ہے۔ یہ بات کہنے والے کیا خود ادبی و تیروں کی گونا گوں معنوی اور علامتی نَے رنگینیوں کا شعور رکھتے ہیں۔ اگر میرا اپنا دماغ بند ہو جائے تو مجھے ہر طرف اندھیرا ہی نظر آئے گا۔ اسی طرح اگر نقاد کا تنقیدی شعور بگڑ جائے تو اِسے ادبی سطح پر سامنے پڑی ہوئی علامت بھی نظر نہیں آتی۔ جبکہ ادب تو بہت گہری فکری اور تنقیدی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اب آگے چلتے ہیں۔ اس جاتک کے بعد ودیاساگر نے ایک اور جاتک کہی۔ جس میں بدھ دیو جی نے بندر کے روپ میں جنم لیا اور جنگل میں بندروں کے راجا بنے۔ یہاں ایک راجہ کا آموں کا باغ تھا، تمام بندر مزے سے یہ آم کھاتے۔ راجا نے حکم دیا کہ باغ کے گرد گھیر اڈالو اور ان بندروں پر تیر چلاؤ کوئی بچ نہ پائے۔ بندر گھبرائے بدھیستو کے پاس آئے۔ بدھیستو نے کہا گھبراؤ نہیں ابھی اس کا اُپائے کرتے ہیں۔ وہ بہت بڑے درخت پر چڑھے جس کی شاخیں گنگا کے پاٹ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان شاخوں کو گنگا پار کے درخت سے باندھا، درمیان میں ان کے جسم کے برابر فاصلہ رہ گیا۔ انہوں نے ایک طرف شاخیں اپنے پیروں میں باندھی اور دوسری طرف کی شاخوں کو ہاتھ سے تھام لیا۔ تمام بندروں سے کہا اس پل پر سے گزرو، تمام بندر دھیرے دھیرے بدھیستو کے اوپر سے گزرے۔ ان بندروں میں دیو دت بھی تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس جنم میں بدھ کا کام تمام کر دیا جائے۔ وہ بدھیستو جی کی پیٹھ پر ایسے کودا کہ وہ ادھ موئے ہو گئے۔ اس جاتک کا سبق یہ ہے کہ راجا ہر حال میں پرجا کا خیال رکھے اور کسی حال میں پرجا کو دکھی نہ ہونے دے۔ چاہے اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

اس کے بعد ودیاساگر نے بکری کی جاتک سنائی جس کا سبق یہ ہے کہ جو دوسروں کا گلہ کاٹتا ہے ایک دن اس کا گلہ بھی ضرور کٹتا ہے۔ اگلی جاتک میں بدھ دیو جی ایک چڑیل کے

بطن سے جنم لیتے ہیں۔ بدھیستو بڑے ہوئے تو انہوں نے انسانوں کے درمیان جانے کا اِرادہ کیا تو ان کی میّا (چڑیل ماں) نے کہا

"میرے لال، تو نے منش جاتی کے بیچ جانے کی ٹھان ہی لی ہے تو اپنی میّا کی بات سن لے کہ چڑیلوں میں گزارہ کرنا آسان ہے آدمی کے ساتھ گزارہ کرنا کٹھن کام ہے۔" (۵)

چڑیل کے منہ سے یہ بات کہلوانا کہ آدمیوں کے درمیان بسر کرنا چڑیلوں سے زیادہ مشکل ہے کیا یہ زیادہ معنی خیز بات نہیں۔ کیا آج کا انسان اپنے باطن میں غیض و غضب میں اپنی باطنی سفاکی اور بد صورتی میں چڑیلوں سے بڑھ نہیں گیا۔ ہمارے چاروں طرف آدمیوں کا سمندر ہے۔ ہم انسانوں کے جہنم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے اپنے رویّے، ہمارا باطن کا یا کلپ کا شکار ہے۔ بظاہر آدمی دکھائی دینا کوئی معرکہ نہیں ہے۔ وجود کی سطح پر انسان بنے رہنا اصل بات ہے۔ اگر میرے باطن پر چڑیل کا رویہ غالب آگیا تو میں انسان ہوتے ہوئے بھی چڑیل ہوں اِسی اصول پر اگر دیگر رویوں کو منطبق کرتے جائیں۔ تو میں مکھی ہوں، بندر ہوں، بکری ہوں، نفس کا زردکتا ہوں، موٹی کھال والا اور چیزوں کا صرف ایک رُخ دیکھنے والا گینڈا ہوں، کانا دجال ہوں، زہر اگلتا سانپ ہوں، اور حالات کا درست شعور نہ رکھنے والا کچھوا ہوں۔

اِسی طرح اگر وجود کی سطح پر ہمارے پاس کچھ مثبت ہے تو پھر ہم گیانی ہوں۔ بدھی مان ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان ہیں۔ اور اپنی اصل جون میں ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ جون کا اصل تعلق ظاہر سے زیادہ باطن سے ہے۔

انتظار حسین اپنی ایک تحریر نئے افسانہ نگاروں کے نام میں لکھتے ہیں:

"تو اگر باقر رضوی کو میری کہانی پر لیبل لگانے کا ایسا ہی شوق ہے تو وہ اسے جاتک کہانی کہہ سکتے ہیں داستانوی کہانی کا نام میرے افسانوں کے سلسلے میں کفالت کرتا نظر نہیں آتا۔ میری جاتک کہانی نئے افسانے کی ذیل میں آتی ہے یا نہیں، پرانی کہانیوں میں جاتی ہے یا کسی ذیل میں یہ میں نے کبھی سوچا نہیں۔ ہاں ایک بات کہوں مجھے بعض نئی لکھی تحریریں نئی پرانی لگتی ہیں۔ جب میں نے جاتک کہانیاں پڑھیں تو لگا کہ بالکل نئی طرز کا فکشن پڑھ رہا ہوں۔ لارنس نے "انجیل" کو ایک ژولیدہ پیچیدہ عظیم ناول سمجھا تھا۔ میں نے مہاتما بدھ کو نیا افسانہ نگار جانا، جوائس کافکا اور کامیو سے الگ۔ مگر جب میں تیس برس پہلے کا نیا اردو

افسانہ پڑھتا ہوں تو لگتا ہے میں کسی دقیانوسی زمانے کا ادب پڑھ رہا ہوں۔" (۶)

انتظار حسین کا ادبی نقطہ نظر ان کے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔ مصنف عہدِ جدید کا انسان ہوتے ہوئے بھی قدیم عہد کی فکری فضاء میں سانس لینا چاہتا ہے۔ دانش کا مرکز و منبع موجودہ عہد ہی نہیں، عہدِ قدیم میں بھی دانش کا ایک بے بہا خزانہ دفن ہے۔ اگر وہاں سے ادیب کوئی خیال لے کر آتا ہے اور اُسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا ہے، تو میرے نزدیک یہ قابلِ تحسین عمل ہے۔ اور اس عمل میں فن کار کی فن کارانہ صلاحیت کا زور بھی دو گنا صرف ہوتا ہے۔ کیونکہ دو عہدوں کی دانش کے درمیان حائل ہزاروں سال کے عصری پتھر کو ہٹانا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بلا شبہ فنکارانہ ید بیضا کا دست یاب ہونا از حد ضروری ہے۔ سو انتظار حسین فنی اور فکری دونوں سطحوں پر ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ اساطیر یا دیو مالائی ادب کو بنیاد بناتے ہوئے، انتظار حسین نے اپنے عہد کی دیو مالا کہی ہے۔ "کچھوے" افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد خان کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انتظار حسین نے اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

> "یہ مخصوص صورتِ حال جس کا آپ نے ذکر کیا میرے تعاقب میں رہتی ہے۔ میں ہابیل قابیل کے عہد میں جاؤں تو اسے مقابل پاتا ہوں۔ یاجوج ماجوج کے داستانی عہد میں جاؤں تو بھی یہ سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ اور بدھ کے زمانے میں چلا جاؤں تب بھی اسے سامنے کھڑا پاتا ہوں اس پر تو میرا بس نہیں، لیکن میں اپنے طور پر اس سے آگے نکل گیا ہوں۔ جہاں تک کچھوے کا تعلق ہے۔ اس کا تانا بانا جاتک کہانیوں سے بنایا گیا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے بھی بدھ کی طرح کئی جنم لیے ہیں۔ اصل میں یہ میں اپنی جاتک کہانیاں لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے جنموں کو یاد کروں اور ان کو قلم بند کروں، یہ میرا مسئلہ ہے مخصوص صورتِ حال نہیں۔"(۷)

انتظار حسین کے افسانے "کچھوے" کا یہ تجزیہ اس افسانے میں شامل تمام جاتکوں کا تجزیہ نہیں ہے۔ اس افسانے میں اور بھی جاتکیں ہیں جن کا تجزیہ اس مضمون کے دوسرے حصے میں لیا جائے گا، اس مضمون کو منطقی انجام دینے کے لیے اس افسانے میں شامل کچھوے کی جاتک کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے۔

"ودیا ساگر نے گوپال کو نصیحت کی کہ زیادہ بولنے میں برائی ہے سو خاموش رہنا فی زمانہ دانائی ہے۔ گوپال بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا تو ودیا ساگر نے گوپال سے کچھوے کی جاتک کہی۔ کہ جب مرغابیوں میں اور کچھوے میں دوستی بہت ہو گئی اور تالاب کا پانی سوکھنے لگا تو مرغابیوں نے کہا کہ اے کچھوے تو بھی ہمارے ساتھ چل کچھوا بولا تم تو اُڑ کر منزل تک پہنچ جاؤ گی میں تو رینگنے والا جانور ہوں، تب مرغابیوں نے کہا ہم تمہیں ساتھ لے جانے کا جتن کریں گی، شرط یہ ہے کہ راستے میں بولنا نہیں، کچھوے نے وعدہ کیا کہ وہ نہیں بولے گا۔ مرغابیوں نے ایک ڈنڈی کچھوے کے سامنے لا کر رکھی اسے مضبوطی سے اپنے دانتوں سے پکڑلے، دوسری طرف سے مرغابیوں نے ڈنڈی منہ میں لی اور اُڑ پڑیں۔ راستے میں لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو اس کا تماشا بنایا۔ کچھوا غصے میں آگیا ان کو بُرا کہنے کے لیے منہ کھولا اور زمین پر گر پڑا۔"
(۸)

اس جاتک کا مفہوم بالکل واضح ہے جو زیادہ بولے گا اپنے مقام و مرتبے سے گر پڑے گا۔ عافیت اسی میں ہے کہ خاموش رہا جائے۔ یا کم از کم اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کس صورت حال میں بولنا اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے برابر ہے۔

وڈیا ساگر اور تمام بھکشو کچھوے ہیں جو راستے میں ہیں۔ جو موقع بے موقع بولے گا وہ گر پڑے گا، روحانیت ہو یا معرفت، سفر خارجی ہو یا باطنی، علم کے حصول، معرفت کی تلاش یا نروان کی جستجو کا سفر، جو کوئی بھی کھینچتا ہے۔ ضبطِ نفس، ان تمام کے حصول کے لیے شرط اوّل ہے۔ کچھوا اِسی ضبطِ نفس کی مضبوطی کا مظاہرہ نہ کر سکا، اپنے مقام سے گرا اور مر گیا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

"انتظار حسین کی کہانی ہمارے موجودہ سیاسی اور تہذیبی، سیاق و سباق میں بھرپور معنویت رکھنے اور ہمیں اپنی صورتحال سے آگاہی دینے کے ساتھ ساتھ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اہم روایتی علامتوں کے ساتھ خاصی دور تک ذہنی سفر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے ایک نادر وقت میں سانس لینے کی خواہش اور مختلف کہانیوں کو آپس میں جوڑ کر تاثر پیدا کرنے کا حوالہ پہلے دیا جا چکا

ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی مختلف تہذیبی روایات کے حوالے سے
کئی لہجے کامیابی سے اپنائے گئے ہیں۔"(۹)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ انتظار حسین، قطرے میں دریا، مشمولہ "ایک شہر کی سراغ میں" ڈاکٹر سہیل احمد خان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص:۱۲

۲۔ انتظار حسین ، مجموعہ انتظار حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص:۶۷۰۔۶۷۱

۳۔ ایضاً، ص:۶۷۱۔۶۷۲

۴۔ ڈاکٹر سعادت سعید، جہت نمائی، لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۵ء، ص:۱۸

۵۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص:۶۷۴

۶۔ ایضاً، ص:۳۶۷

۷۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان، مجموعہ ڈاکٹر سہیل احمد خان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۱۲۱

۸۔ انتظار حسین ، مجموعہ انتظار حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص:۶۷۵

۹۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان، مجموعہ ڈاکٹر سہیل احمد خان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۳۸